انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کی سماجی، ثقافتی اور لسانی تربیت میں ''سرمایہ اُردو'' کا کردار

(پنجاب کے تعلیمی اداروں میں اُردو لازمی کی درسی کتاب کا ایک تجزیاتی جائزہ)

محمد سلیمان اطہر *
ڈاکٹر انوار احمد **

Abstract:

National language of Pakistan is also frequently used as a Lingua Franca throughout Pakistan. It is used as a medium of instruction from nursery to Ph.D. level for the teaching of various subjects at different institutions. In Punjab, it is being taught as a compulsory subject from nursery class to intermediate level in public institutions. However, strange hypocritical behaviour is being observed for the teaching of Urdu compulsory. It is a universal truth that each normal student often learns the primary skills ''Listening & Speaking'' of his/her mother tongue e.g; Punjabi, Seraiki, Pothohari, Hindko, Mewati and Rohtaki etc. for communication purposes before seeking his/her admission in a formal school. There, they are directly taught the secondary skills "Reading & Writing" of Urdu language and primary skills are generally ignored. In this way, they cannot get full command over four skills of Urdu and consequently show a lingual deficiency. In this article, both parts of text book of Urdu compulsory for intermediate classes are analyzed and criticized in the perspective of its prose and verse contents. It has tried to establish the point that the content does not meet the social, cultural and lingual requirements of the students. It has been proposed that it should be revised keeping in view the culture and social requirements of the taught.

---

* پی ایچ۔ڈی۔ سکالر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
** آر، آئی، ڈبلیو، ایل (RIWL) اوساکا یونیورسٹی، جاپان

دنیا کے ہر آزاد اور خود مختار ملک میں بسنے والی قوم کے باشندے اپنے مخصوص نظریات، عقائد، مادری زبان، مقامی ثقافت، تہذیب وتمدّن، ملکی مفادات اور قومی مقاصد کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بچوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتی ہے۔ دنیا کے ہر تعلیمی نظام میں ذریعہ تعلیم کی زبان ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر طالب علم ذریعہ تعلیم کی زبان کی مختلف مہارتوں میں ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو ان کی مجموعی تعلیمی کارکردگی تسلّی بخش نہیں رہتی۔ پاکستان کی قومی زبان 'اُردو' صوبہ پنجاب کے کم وبیش تمام سرکاری، نیم سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں نرسری سے لے کر بارھویں جماعت تک نہ صرف ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے بلکہ بیشتر سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں میں یہ ذریعہ تعلیم کی زبان کے طور پر بھی لاگو ہے۔ کالج وجامعات کی سطح پر آرٹس کے بعض مضامین اُردو ذریعہ تعلیم ہی میں پڑھائے جارہے ہیں۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں مختلف درجات میں تدریس اُردو کے لیے بالعموم ایک درسی کتاب تیار کرنا ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے اور اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ درسی مواد میں اُردو ادب سے مختلف ٹکڑے اور اجزاء شامل کر دینے سے ریاضی کے فارمولے کی طرح تدریسِ زبان کے سارے مسائل حل نہیں ہو جائیں گے۔[۱] مختلف درجات کی اُردو لازمی کی درسی کتب کے اسباق کا اپنے مواد، موضوعات، الفاظ وتراکیب کے استعمال، فقرات کی ساخت، ذخیرہ الفاظ اور اسلوب کے لحاظ سے کوئی منطقی ربط تسلسل اور تدریج نظر نہیں آتے۔ پنجاب کی دیہی وشہری معاشرت اور سماج کے طلبا وطالبات کے لیے اُردو لازمی کا ایک جیسا نصاب لاگو ہے جو دونوں طرح کے ماحول کے پروردہ طالب علموں پر اچھا لسانی اثر نہیں ڈالتا۔ اُردو لازمی کی نصاب سازی کے وقت طلبا وطالبات کی مادری زبان کی لسانی عادات، ان کے والدین کی تعلیم ومعاشی پس منظر، جغرافیائی محل وقوع، ثقافتی اقدار اور ان کے سماجی ومعاشرتی حالات یکسر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ اُردو لازمی کے درسی متن کے تعین میں طالب علموں کی طبعی اور ذہنی عمر تو درکنار، ان کی نفسیات کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔[۲]

پاکستان کے نصاب ساز ادارے گزشتہ ساٹھ سالوں سے صوبہ پنجاب میں اُردو لازمی کی درسی کتب کے نصاب کے حوالے سے کسی قدر تدریسی منافقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں کیونکہ پنجاب کی دیہی معاشرت میں پیدا ہونے والا ہر طالب علم ابتدائی سکول میں داخلہ لینے سے پہلے پہلے اپنے مادری ''پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری، ہندکو، پشتو، روہتکی، میواتی وغیرہ'' کی دو بنیادی لسانی مہارتیں ''سننا، بولنا'' سیکھ کر آتا ہے۔ ابتدائی سکولوں میں اسے اپنی مادری زبان کی ثانوی مہارتیں ''پڑھنا، لکھنا'' سکھانے کی بجائے براہِ راست ثانوی زبان اُردو کی ثانوی لسانی مہارتیں ''پڑھنا، لکھنا'' سکھانا شروع کر دی جاتی ہیں۔ اس تدریسی نظام کے تحت ثانوی زبان اُردو کی ابتدائی

مہارتیں ''سننا، بولنا'' نظر انداز ہو جاتی ہیں جو اگلے درجات میں طالب علموں کی لسانی خامیوں کا سبب بنتی رہتی ہے کیونکہ وہ اپنی مادری زبان اور اُردو کی تمام لسانی مہارتوں میں ادھورے رہتے ہیں۔ اس طرح پنجاب کے طالب علم اُردو زبان کی چاروں مہارتوں پر کماحقہ عبور حاصل نہیں کر پاتے۔ کسی زبان کی تعلیم و تدریس میں سب سے بڑی رکاوٹ اور خامی طالب علموں کے لیے ایک غیر معیاری، غیر مربوط اور بچوں کی ثقافتی و سماجی ضروریات سے غیر ہم آہنگ روایتی نصاب ہے۔(۳) اگرچہ پنجاب کے شہری علاقوں میں اُردو بول چال کا عام رواج ہے تاہم یہ پنجابیوں، سرائیکیوں، ہندکو اور پوٹھوہاری باشندوں کے لیے ایک ثانوی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن پنجاب کے سکول و کالج میں اُردو لازمی مادری زبان سکھانے کے اصولوں کے تحت پڑھائی جا رہی ہے اور مواد کے طور پر قدیم اُردو ادب کا سہارا لیا گیا ہے جو اپنے مواد اور الفاظ و تراکیب کے استعمال کے تناظر میں طلبا و طالبات کی معاشرت سے بے حد لسانی اور ثقافتی مغیرت کی وجہ سے ان کے لیے اجنبیت کا حامل ہے۔ پنجاب کے طالب علموں کو ''اُردو'' بطور ثانوی زبان پڑھانے کے لیے یہ ایک انتہائی فرسودہ اور غیر مفید نصاب ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی لکھتے ہیں:

> ''اُردو زبان کے موجودہ نصاب میں ہماری روزمرہ ضروریات کی گنجائش بہت کم ہے۔ وہ ہماری زندگی کے بعض عملی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ میٹرک یا انٹرمیڈیٹ پاس طالب علم ضرورت پڑنے پر فوری طور پر چار سطروں کی درخواست نہیں لکھ سکتا۔ اس میں اس بے چارے کا بھی کوئی قصور نہیں۔ ''قصہ یمن کے باشاہ کا'' یا میرؔ و غالبؔ کی غزلیں پڑھا کے ہم اس سے روزمرہ زندگی سے متعلق ضروری تحریریں لکھنے کی توقع رکھنے میں حق بجانب بھی نہیں۔''(۴)

وفاقی نصاب ساز ادارے کی مرتّب کردہ نصابی دستاویزات میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اُردو لازمی کے مضمون کے لیے گیارھویں اور بارھویں کی تقسیم کے ساتھ اُردو نظم و نثر کی اصناف اور ان اصناف کے لیے مصنّفین کے نام تجویز شدہ ہیں اور یہ نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ ان اصناف کے کتنے سبق درسی کتاب میں شامل کیے جائیں گے۔(۵) صوبہ پنجاب میں لاگو اُردو لازمی کی درسی کتاب ''سرمایہ اُردو'' کے عنوان سے حصّہ نثر، حصّہ نظم اور حصّہ غزل میں منقسم ہے۔ ان تینوں حصّوں میں وفاقی نصاب ساز ادارے کی نصابی سفارشات کی روشنی میں اُردو ادیبوں اور شاعروں کے ادب پاروں سے منتخب اقتباسات شامل ہیں۔ یہ ''انتخاب'' نصابی دستاویز کی سفارشات سے باہر نہیں ہوتا۔(۶)

دنیا کی ہر زندہ زبان ارتقاء پزیر ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک زندہ زبان ہونے کے ناتے اُردو کی تدریس ماضی کے چند مخصوص اُردو ادیبوں کی تحریروں اور ادبی کاوشوں کے ذریعے ممکن نہیں ہو سکتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے شمار معرب و مفرس الفاظ متروک اور غیر معروف ہو چکے ہیں اور ملکی و غیر ملکی زبانوں مثلاً پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو

خصوصاً انگریزی وغیرہ کے نئے نئے الفاظ اُردو ذخیرہ الفاظ کا حصّہ بن رہے ہیں۔قومی زبان اُردو کا سب سے بنیادی مقصد انھیں اس قابل بنانا ہے کہ وہ عملی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کے لیے کسی قسم کی لسانی مشکلات سے دوچار نہ ہوسکیں۔ بقول ڈاکٹر عطش درّانی انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ''اُردو لازمی'' کے ایک خاص نصابی درسی مواد کی ضرورت ہے جو پری میڈیکل، پری انجینئر نگ، جنرل سائنس وانفارمیشن ٹیکنالوجی، آرٹس اور کامرس کے طالب علموں کو مستقبل میں عملی زندگی کے مختلف پیشوں کے دوران لسانی فہم وفراست کی بنیاد فراہم کر سکے(۷) اگرچہ عملی زندگی میں مذکورہ پانچوں گروہوں کے طالب علموں کی لسانی ضروریات الگ الگ ہیں تاہم ان کے لیے اُردو لازمی کی ایک ایسی مشترک درسی کتاب مرتّب کی جاسکتی ہے جو بیک وقت ان تمام گروہوں کی اُردو زبان میں مختلف لسانی مہارتوں کو بہتر بنانے میں مفید ثابت ہوسکے۔

گیارھویں جماعت کی درسی کتاب کے حصّہ نثر میں شخصیت، افسانہ، مضمون، مکتوب، طنز ومزاح اور لوک داستان جیسی اصناف جبکہ بارھویں جماعت کی درسی کتاب کے حصّہ نثر میں شخصیت، مضمون، ناول، خاکہ، سفرنامہ، افسانہ اور ڈرامہ جیسی اصناف کے نمونے درسی اسباق کے طور پر موجود ہیں۔ دونوں کتب کے حصّہ نظم کا آغاز ''حمد'' سے ہوتا ہے اور اس کے بعد ''نعت'' شامل کی گئی ہے۔ گیارھویں جماعت کی درسی کتاب کے حصّہ غزل میں آٹھ شعراء کی دو دو غزلیں اور بارھویں جماعت کی درسی کتاب کے حصّہ غزل میں پانچ شعراء کی دو دو غزلیں اور دو شعراء کی ایک ایک غزل درسی اسباق کی حیثیت سے شامل ہے۔

سرمایہ اُردو برائے گیارھویں جماعت

حصّہ نثر میں پہلا سبق سید سلیمان ندوی کا ''اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم'' ہے جو ان کی کتاب ''خطباتِ مدراس'' سے لیا گیا ہے۔اس سبق کا مواد اپنے اسلوب کے لحاظ سے پڑھنے سے زیادہ کسی مقرر یا خطیب کی زبان سے سننے کی چیز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان کی کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کیونکہ اس میں چھوٹے چھوٹے حصّوں میں منقسم طویل جملے ہیں۔ جابجا معرب ومفرس مشکل الفاظ اور تراکیب استعمال کیے گئے ہیں۔ تاریخی تلمیحات اور دیگر حوالوں کی کثرت ہے۔اس سبق کی تفہیم اور وضاحت کے لیے اسلامی تاریخ وسیرت سے واقفیت ازحد ضروری ہے۔سرسیّد احمد خاں کا مضمون ''اپنی مدد آپ'' کا اسلوب بھی کسی حد تک غیر دلچسپ ہے جسے کالج کے طالب علموں کے لیے سمجھنا ایک آسان کام نہیں ہے۔یہ ان کی کتاب ''مقالات سرسیّد: جلد پنجم'' سے لیا گیا ہے۔اس مضمون میں غلامی کا مفہوم واضح کرتے ہوئے سرسیّد نے اپنا ایک منفرد نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ مضمون فرسودہ (out of date) ہوکر اپنی قدر وقیمت کھو چکا ہے۔ پنجاب کی موجودہ ثقافت، سماج اور معاشرے سے اس

کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ تیسرا سبق ''سرسیّد کے اخلاق وخصائل'' مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیف ''حیاتِ جاوید'' میں سے ایک اقتباس ہے۔ یہ سبق سرسیّد احمد خاں کی ایک مدلّل مداحی ہے جس میں معرب ومفرس الفاظ کی بھرمار ہے۔ دوسرے سبق کے مصنف اور تیسرے سبق کے عنوان میں لفظ ''سرسیّد'' کے تکرار سے بیشتر طلبا وطالبات غلط فہمی کا شکار ہو کر ان اسباق کے مصنف کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ درج بالا تینوں اسباق اسالیبِ اُردو نثر کی ایک ادھوری اور مدھم سی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ کسی مصنف کی کتاب کی بجائے اس کی ایک مختصر سی تحریر سے اس کے اسلوب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ایسے اقتباسات سے طلبا وطالبات کے ذہن انتشار کا شکار ہو سکتے ہیں۔ وہ نہ تو ادبیت سیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی ان کی علمی ولسانی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز اکیسویں صدی کے پنجاب کے سماج سے ان کی مطابقت نظر نہیں آتی ہے۔ جہاں تک اسلاف اور ان کے کارناموں سے متعارف کرانے کا سوال پیدا ہوتا ہے ،تو اس کے لیے الگ سے مطالعہ پاکستان میں تحریک پاکستان کا حصّہ شامل ہوتا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے درجات تک ''اُردو زبان'' کی تدریس میں ان کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔

اگرچہ حمید عسکری کا مضمون ''ابولقاسم الزہراوی'' ایک معلوماتی سبق ہے تاہم اس میں بعض ایسے نامانوس عربی الفاظ مثلاً قاثاطیر، مقامام الاسنان، خنازیر، محقن، تامہ وغیرہ استعمال کیے گئے ہیں جن کا آج زبان میں چلن نہیں ہے۔ یہ ایک ادھورا سا سبق ہے جس کی تفہیم کے لیے سپین کی مسلم تاریخ سے استفادہ ضروری ہے۔ ایسے اسباق کے لیے جنرل سائنس کا مضمون زیادہ موزوں ہے۔ مسلم مشاہیر کے انتخاب کے لیے صرف عربی النسل افراد ہی کیوں؟ پنجاب کی سرزمین سے بھی کسی مشہور شخصیت کو چنا جا سکتا ہے۔ پریم چند کا افسانہ ''ادیب کی عزت'' ایک طویل افسانہ ہے جس کی جزئیات طالب علموں میں بوریت کا عنصر پیدا کر دیتی ہیں۔ اس میں پیش کیا گیا ادیب کا تصور فرسودہ اور تضادات کا مجموعہ ہے کیونکہ ادیب معاشرے کا نبض شناس ہوتا ہے، کوئی عام اور سادہ لوح شخص نہیں ہوتا ۔علاوہ ازیں اس کا پنجاب کی ثقافت، سماج یا معاشرت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس افسانے میں ''مسئلہ وحدت الوجود'' کے حوالے سے چند متنازعہ فقرے موجود ہیں یعنی:

> ''ہر شخص کے دل میں اعزاز واحترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصّہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر وناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔''(۸)

غلام عباس کا افسانہ ''اوورکوٹ'' اور احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سفارش'' اچھا انتخاب ہیں۔ یہ دونوں افسانے پنجاب کی ثقافت، معاشرت اور سماج سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ طالب علموں میں ادبی ذوق پیدا کرنے

کے لیے موٴثر ثابت ہو سکتے ہیں اوران کی لسانی قابلیت میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں کیونکہ ان کا اسلوب عام فہم ہونے کی وجہ سے یہ طالب علموں کے ذہنوں پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ ہاجرہ مسرور کا علامتی ونفسیاتی افسانہ ''چراغ کی لو'' انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کی ذہنی سطح سے بہت بالا ہے۔ اگرچہ اس میں معاشی استحصال، غربت کے معاشرتی اثرات اور چند نامکمل پوشیدہ خواہشات کی طرف اشارے ہیں تاہم اسے کمرہ جماعت میں سمجھانا قدرے مشکل عمل محسوس ہوتا ہے۔ افسانے میں تکرار سے آنے والے کلمات ''سفید سفید کپڑوں میں لپٹے ڈھانچوں کی کھڑ کھڑاہٹ'' طالب علموں کے ذہنوں پر ایک سوالیہ تاثر چھوڑتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولت بستی بستی، قریہ قریہ اور شہر شہر عام ہونے کی وجہ سے عوامی سطح پر مکتوبات نگاری کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ مکتوباتِ غالب اور مکتوباتِ اقبالؒ کو درسی اسباق کے طور پر شامل کرنا علمی، ثقافتی، سماجی اور لسانی اعتبار سے بالکل غیر مفید اور غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احمد شاہ بخاری پطرس کی تصنیف ''پطرس کے مضامین'' سے منتخب مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' اپنی تازگی کھو چکا ہے جس میں طالب علموں کو مزاح کوشش کر کے نظر آ سکتا ہے۔ اس سبق میں پوشیدہ طنز اور تاریخی تلمیحات مثلاً اہلِ سیف، اہل زبان، نظام سقہ، تاریخی گڑھے اور خندقیں وغیرہ طالب علموں کی ذہنی سطح سے بلند ہیں۔ سبق کا آخری فقرہ ''لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں'' قابل اعتراض ہے کیونکہ آج لاہور شہر میں متنوع قسم کے لوگ آباد ہیں۔ پنجاب میں صرف پنجابی لسانی گروہ ہی آباد نہیں ہے بلکہ یہاں ''سرائیکی'' ایک دوسرا بڑا لسانی گروہ ہے۔ سرائیکیوں کے علاوہ پوٹھوہاری، ہندکو اور دیگر چھوٹی چھوٹی زبانیں مثلاً میواتی، روہتکی اور رانگڑی بولنے والے باشندے بھی آباد ہیں۔ بقول سیّد خیال بخاری کسی زبان کا اثاثہ اس زبان کے بولنے والوں کی ضروریات اور معلومات پر مشتمل ہوتا ہے[۹] جبکہ درج بالا سبق میں صرف ایک مخصوص پنجابی خطے کے ایک قدیم شہر کی طنز ومزاح کے انداز میں ایک مدھم اور ادھوری سی جھلک دکھائی جا رہی ہے۔ لاہور شہر سے دور دراز رہنے والے سرائیکی یا پوٹھوہاری بچے اس میں مندرج معلومات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سبق میں طنز ومزاح کی علمی باریکیاں سمجھنے کے لیے ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے جو انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں میں بالعموم نہیں پایا جاتا۔ شفیع عقیل کی لوک داستان ''دوستی کا پھل'' انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کی ذہنی سطح سے بہت ہی نیچے ہے۔ لہٰذا ایسے اسباق مڈل کے درجات میں شامل کیے جانے چاہیے انھیں انٹرمیڈیٹ کے طلبا وطالبات کے لیے منتخب کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ابن انشا کے سفرنامے ''دنیا گول ہے'' میں لیا گیا اقتباس ''کیا واقعی دنیا گول ہے؟'' ایک نامکمل اور بے ربط سی تحریر ہے جس میں بیان کی گئی شخصیات مثلاً فضل الباری، بیگم وجیہہ ہاشمی اور ڈاکٹر طیب محمود آج کے طالب علموں

کے لیے گمنام افراد کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔اس میں چند داستانوی حوالے مثلاً ''شہزادی مہرافروز، حاتم طائی، منیر شامی، سند باد'' طالب علموں کے لئے عام فہم نہیں۔اس سے ان کی علمی، ادبی یا سماجی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے منتخب کیا گیا سبق ''اور آنا گھر میں مرغیوں کا'' کا معیار انٹر کے طلبا و طالبات کی ذہنی سطح سے بلند ہے کیونکہ یوسفی کے اسلوب میں تہہ در تہہ جملے ہوتے ہیں۔فارسی، عربی اور انگریزی کے الفاظ وتراکیب کے علاوہ تلمیحات بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔مذکورہ بالا دونوں اسباق ایسے ہیں جنھیں صرف ایک تربیت یافتہ قاری ہی سمجھ سکتا ہے۔اس لیے ایسے اسباق کی تدریس صرف ایم اے کی سطح پر ہی معقول دکھائی دیتی ہے۔

حصّہ نظم کا آغاز حسب روایت امیر مینائی کی ''حمد'' کیا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی وجودیت کے فلسفے کو بڑی سادگی اور سلاست سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دوسری نظم ماہرالقادری کی 'نعت' ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے چند اہم اور بڑے خصائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔تاہم اس کے آخری شعر کا دوسرا مصرع ''ماہر سا گنہگار ہے، وابستہ داماں'' نعت کے بنیادی تقاضوں کی نفی کرتا ہے کیونکہ نعت اپنی ہیئت کے اعتبار سے قصیدے سے مختلف ہوتی ہے اور اس مصرعے سے قصیدے کا رنگ ڈھنگ معلوم ہوتا ہے۔نظیر اکبر آبادی کی نظم ''تسلیم ورضا'' ایک علمی و اخلاقی نظم ہے جس میں بظاہر ''فقر'' کا مفہوم اور فلسفہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن آج کے مادہ پرستی کے دور میں انسانوں کی اس دنیا میں کوئی شخص بھی فرشتہ صفت بن کر نہ تو ''فقر'' کی حالت اختیار کر سکتا ہے اور نہ ہی ہر حالت میں خوش رہ سکتا ہے۔یہ نظم پاکستانیوں کے ثقافتی، سماجی اور معاشرتی رویوں کی عملاً نفی کرتی ہے۔جیسا کہ پہلے شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

ے جو فقر میں پورے ہیں، وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں، ہر دام میں، ہر حال میں خوش ہیں (۱۰)

میر انیس کی نظم ''میدانِ کربلا میں صبح کا منظر'' ان کے ایک طویل مرثیے کا ابتدائی حصّہ ہے۔اس کی زبان بے حد مفرس اور اسلوب مشکل ہے۔بعض پرندوں کے ناموں کے لیے اُردو کی بجائے فارسی الفاظ مثلاً درّاج، کبک، تیہو، طاؤس، مرغانِ خوش نوا، قمری وغیرہ استعمال کیے گئے ہیں۔مرثیے کی روایت اور بنیادی ہیئت سے ناآشنا افراد اور مخصوص مسلک کے طالب علم کے سوا بالعموم اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔مولانا ظفر علی خاں کی نظم ''مستقبل کی جھلک'' قیامِ پاکستان سے قبل کے حالات میں مسلمان رہنماؤں کی خواہشات اور سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔اگرچہ یہ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت کی حامل ہو سکتی ہے تاہم پاکستان معرضِ وجود میں آنے کے بعد اسے اُردو کے نصاب میں شامل کرنا بظاہر معقول دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اپنے مواد کے اعتبار سے یہ نظم تروتازہ نہیں رہی۔

اختر شیرانی کی نظم ''برسات'' رومانوی اور خیالی انداز میں صرف بارش کے پانی کی مختلف حالتوں کو بیان کرتی ہیں کیونکہ دیہی اور شہری نیز میدانی، ریگستانی اور پہاڑی علاقوں میں برسات کے مناظر ایک جیسے نہیں ہوتے چنانچہ برسات کے پنجاب کے لوگوں کی معاشرتی، معاشی اور نجی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کا اس نظم میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نظم کا مواد اپنے عنوان کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ برسات کے موضوع پر نظیر اکبر آبادی کی نظم ''برسات کی بہاریں'' زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ حفیظ جالندھری کی نظم ''ہلالِ استقلال'' میں پرچم غیر مناسب تکرار ہے۔ نظم میں پرچم کے حوالے سے حفیظ جالندھری کی رائے غیر متوازن دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس نے پاکستانی پرچم اور اس پر بنے ہلالی چاند کی اسلامی تاریخ کے حوالوں سے وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ پرچم میں موجود سفید رنگ کے حوالے سے کوئی مدلّل اور معقول وضاحت نہیں ملتی۔ ایسی نظم پڑھنے سے پاکستان کے غیر مسلم طلبا و طالبات کیا تاثر لے سکتے ہیں؟ کیونکہ سفید رنگ غیر مسلم پاکستانیوں ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ سے لی گئی مختلف تلمیحات مثلاً انگشتِ شہادت کا اشارا، سیف اللہ، حسینؓ بن علیؓ، محمد بن قاسم، طارق (بن زیاد)، صلاح الدین (ایوبی) اور محمود (غزنوی) کے کارناموں کا پاکستان کے قومی پرچم سے تعلق زبردستی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نظم کا پنجاب کے پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری، ہندکو اور دیگر چھوٹی چھوٹی لسانی اکائیوں کے طالب علموں کی ثقافت اور سماج سے کیا تعلق ظاہر ہوتا ہے؟

علامہ اقبالؒ کی دو نظمیں ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' اور ''پیغام'' شامل نصاب ہیں۔ پہلی نظم کا نہ صرف عنوان مفرس ہے بلکہ اس کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع اور آخری شعر مکمل طور پر فارسی زبان میں ہیں۔ دونوں نظموں میں ایسے اشعار شامل ہیں جن میں فلسفیانہ مضامین بیان کیے گئے ہیں جن کی بنا پر یہ دونوں نظمیں گیارھویں و بارھویں جماعتوں کے طالب علموں کے علمی معیار سے بہت بلند ہیں۔ اسی لیے وہ ان نظموں کے اشعار کی تشریح سمجھنے میں بہت دقّت محسوس کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار سے بلند درجہ فلسفیانہ خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ے دیکھ آ کر کوچہ چاکِ گریباں میں کبھی! قیس تُو، لیلا بھی تُو، صحرا بھی تُو، محمل بھی تُو
ے وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا مے بھی تُو، مینا بھی تُو، ساقی بھی تُو، محفل بھی تُو (۱۱)

سید محمد جعفری کی نظم ''ایبسٹریکٹ آرٹ'' ایک ایسی نظم ہے جس میں مانوس ثقافت کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ شاعر اپنے ذاتی مشاہدے کو منظوم شکل میں پیش کرتا ہے اور اس سے صرف تربیت یافتہ قاری ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ نظم اپنے مواد کے تناظر میں بیشتر نہ دیہی و قصباتی بلکہ بیشتر شہری طالب علموں کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے کیونکہ اس کی تدریس کے لیے فائن آرٹ کے مضمون کا مختلف تصاویر کی مدد سے تعارف کرانا اور اس کے بنیادی

خدوخال بیان کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ کمرہ تدریس میں فائن آرٹ ک تصاویر کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تدریس کے دوران طالب علم بوریت محسوس کرتے ہیں۔ مرزا محمود سرحدی کے ''قطعات'' (شاعر، اخباری اشتہار، غفلت، ریڈیو) ہماری بعض معاشرتی خرابیوں پر تنقید ہیں اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے تاثیر رکھتے ہیں۔ دلاور فگار کی نظم ''لوکل بس'' ایک خوبصورت نظم ہے جو پنجاب کی معاشرت اور سماج کے ایک پہلو کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مست توکلی کی نظم ''وحدانیت'' اور حمد کا مرکزی خیال ملتا جلتا ہے اور اسے درسی سبق کے طور پر شامل کرنا تکرار کے زمرے میں آتا ہے۔

حصّہ غزل میں میر تقی میر، حیدر علی آتش، میرزا خاں داغ، مومن خاں مومن، حسرت موہانی، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی دو دو منتخب غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ میر کی پہلی غزل ''جس سر کو غرور ہے، یاں تاج وری کا'' کے اشعار آفاقیت کے حامل ہیں۔ میر کی دوسری غزل ''گل کو ہوتا صبا! قرار اے کاش!'' ایک فارغ البال اور دل جلے عاشق کے تلخ تجربات اور اپنے محبوب سے وصل کے لیے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے جبکہ آج کے مادی دور میں ایسے عاشق کہاں موجود ہیں؟ موبائل اور انٹرنیٹ کے دور میں اس غزل کے مضامین غیر موزوں اور بے مقصد معلوم ہوتے ہیں۔ حیدر علی آتش کی پہلی غزل ''ہوائے دورِ مئے خوش گوار، راہ میں ہے'' کے مضامین جزوی طور پر مناسب ہیں۔ تاہم اس میں مفرس الفاظ و تراکیب کا استعمال نظر آتا ہے جبکہ دوسری غزل ''یہ آرزو تھی، تجھے گل کے روبرو کرتے'' ایک رومانوی اور تخیلاتی ہے جس میں ایک ناکام عاشق کے جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ اکیسویں صدی کے پنجاب کی معاشرت اور ثقافت سے اس غزل کے مضامین بالکل مطابقت نہیں رکھتے اور ایسی غزل کو نصاب میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ آتش کی غزلیات میں اس سے بہتر انتخاب موجود ہے۔ میرزا خان داغ کی دونوں غزلیں یعنی ''پھرے راہ سے وہ، یہاں آتے آتے'' اور ''خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا'' رومانوی فضا کی حامل ہیں۔ ان کے مضامین میں وہ ایک روایتی عاشق کا رونا دھونا اور محبوب سے تصور ہی تصور میں گفتگو شامل ہیں۔ ان کی بجائے میرزا خان داغ کی بہتر مضامین کی حامل غزلیں منتخب کی جاسکتی ہیں۔ تاہم ثانوی زبان کی حیثیت سے اُردو کی مختلف مہارتوں کے سیکھنے کے حوالے سے پہلی غزل کے مقطع میں بہت کمال کا مضمون باندھا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض چند اسباق کی تدریس سے اُردو زبان پر ملکہ حاصل نہیں ہوسکتا:

ع نہیں کھیل اے داغؔ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زبان، آتے آتے (۱۲)

مومن خاں مومن کی غزلوں میں بھی مفرس تراکیب موجود ہیں اور محبوب سے معاملہ بندی کے مختلف

پہلوؤں اور قلبی وارتوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے تاہم یہ غزلیں انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کی ذہنی سطح سے بالا ہیں۔ یہ ان کی ثقافت، معاشرت اور سماج سے مطابقت نہیں رکھتیں۔علاوہ ازیں، دوسری غزل کا مقطع '' مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم''سُنّی اور وھابی مسالک کے مابین مسلکی تنازعہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جبکہ اُردو کی درسی کتاب کے مشمولات تمام مسالک سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے لیے یکساں طور پر لاگو ہیں۔حسرت موہانی کی بھی پہلی غزل '' بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں'' میں اپنے محبوب سے جدائی کی کیفیت کے مختلف جذبات اور احساسات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری غزل '' رسمِ جفا کامیاب، دیکھیے کب تک رہے''، برصغیر میں انگریز دور کے سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اسے اُردو کی درسی کتاب کی بجائے مطالعہ پاکستان کے مضمون میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

فیض احمد فیض کی دونوں غزلیں '' نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا'' اور '' کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں'' نہ صرف بہت زیادہ مقرّس ہیں بلکہ خالصتاً سیاسی پس منظر کی حامل ہیں۔دوسری غزل کے بعض اشعار اپنے بلند پایہ فکری و سیاسی مضامین کی وجہ سے سیاسی و مذہبی مقررین کی تقاریر کا حصّہ بنتے رہتے ہیں۔مجموعی طور پر دونوں غزلیں گیارھویں جماعت کے نابالغ طالب علموں کے تخیل و تفہیم سے کہیں بلند ہیں۔ایسی غزلیں جامعات کی سطح پر اُردو کے نصاب کے لیے منتخب کی جانی چاہیے کیونکہ اس سطح پر طالب علم کافی حد تک بالغ النظر ہو جاتے ہیں۔ان غزلوں کی بجائے فیضؔ کے کلام سے نسبتاً آسان فہم کلام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔احمد ندیم قاسمی کی منتخب غزلیں مجموعی طور پر فلسفیانہ مضامین کے حامل ہیں۔پہلی غزل کا مقطع '' شاعری روزِ اوّل سے ہوئی تخلیق، ندیمؔ'' متنازعہ نقطہ نظر کا حامل ہے جبکہ دوسری غزل '' اب تو کچھ اور ہی، اعجاز دکھایا جائے'' میں سیاسی و انقلابی نظریات پیش کیے گئے ہیں جو گیارھویں جماعت کے طالب علم کے لیے عام فہم نہیں ہیں۔

سرمایۂ اُردو برائے بارھویں جماعت

حصّہ نثر: پہلا درسی سبق '' مناقبِ عمر بن عبدالعزیز'' علاّمہ شبلی نعمانی کی تصنیف '' مقالاتِ شبلی، جلد چہارم'' سے لیا گیا ہے، اسے اُردو لازمی کی درسی کتاب کی بجائے معاشرتی علوم کے مضمون میں اسلامی تاریخ کا حصّہ ہونا چاہیے۔سیاق وسباق کی عدم موجودگی میں یہ ادھورا سبق ہے کیونکہ عمر بن عبدالعزیز کی ذات و شخصیت اور اس میں مذکور دیگر افراد کا تعارف کرائے بغیر ان کے مناقب سے روشناس کرانا فضا میں قلعے تعمیر کرنے کے مترادف ہے۔ مناقب کی آڑ میں بنو اُمیّہ کے دورِ حکومت کے کیڑے نکال کر بچوں کے سامنے پیش کرنا بھی ایک منفی رویہ ہے۔اس میں غیر معروف معرّب الفاظ بھی موجود ہیں۔میاں بشیر احمد کا مضمون '' تشکیل پاکستان'' بھی تحریک پاکستان کے پس

منظر میں ایک نامکمل سبق ہے جسے مطالعہ پاکستان کے مضمون میں شامل کیا جانا چاہیے۔ سبق کے پیرا گراف میں ایک منطقی ربط، روانی اور تسلسل کی کمی کی وجہ سے طالب علموں کی واضح اکثریت اس سبق کا خلاصہ بیان کرنے اور اس کے کسی منتخب اقتباس کی سیاق و سباق کی روشنی میں تشریح کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اقبال کے چند مشکل اشعار کی موجودگی میں یہ سبق مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ استاد نثری سبق میں اشعار کی تشریح کرائے یا سبق کی جزئیات کی وضاحت کرے۔ مولوی عبدالحق کا خاکہ ''نواب محسن الملک'' ایک غیر متوازن سیاسی خاکہ ہے جس میں نواب محسن الملک کی محض مدح سرائی کی گئی ہے۔ اس سبق میں ہمیں کہیں بھی علمی، ادبی، ثقافتی یا لسانی اظہار نہیں ملتا۔ ایک جگہ تضاد کا عنصر بھی موجود ہے۔ مثلاً

> ''انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو ان کے مذاق کی ہوتی تھیں، اُن کا ترجمہ کرا کر پڑھتے تھے اور بحث کرتے تھے۔''(۱۳)

مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''نیرنگِ خیال'' سے منتخب کیا جانے والا مضمون ''محنت پسند، خردمند'' ایک تمثیلی مضمون ہے جو بارھویں جماعت کے بچوں کی ذہنی سطح اور تفہیم سے بہت زیادہ بلند ہے کیونکہ ان درجات میں طالب علموں کی قوتِ متخیّلہ اور علمی ذخیرہ بہت ہی محدود ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد کے ایسے مضامین انٹرمیڈیٹ کے کسی بھی درجے میں شامل نہیں ہونے چاہیے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں کے مطالعے سے پہلے ان کی منتشر اور پریشان حال شخصیت کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ہر ادیب کے ادب میں اس کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اسلم فرخی اپنے کتاب ''نگارستانِ آزاد'' (طبع شدہ: جنوری ۲۰۱۰ء) کے ابتدائی باب میں محمد حسین آزاد کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آزاد عربی کے پروفیسر تھے اور فارسی ان کے گھر کی زبان تھی۔ آزاد کے ذہن میں بچپن ہی سے گرہیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ وقت گزرتا گیا، گرہیں بڑھتی گئیں، سخت ہوتی گئیں، پہلے واہمہ تھا، پھر واہمے نے مراق کی شکل اختیار کر لی، مراق بڑھا تو خبط میں تبدیل ہو گیا۔ خبط مالیخولیا بن گیا اور آخر آخر جنون ہو گیا۔ آزاد ساری زندگی ان کیفیات سے گزرتے رہے اور حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔(۱۴) ایک ایسے ادیب کی تحریروں سے ہم پنجاب کے طلبا و طالبات کو کیا سکھانا چاہتے ہیں؟ مولانا محمد حسین آزاد کی تحریریں صرف ذہنی بالغ اور تربیت یافتہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ایم اے کی سطح پر آزاد کے مضامین کا مطالعہ کسی حد تک درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

درسی سبق ''اکبری کی حماقتیں'' مولوی نذیر احمد کے ناول ''مرأۃ العروس'' سے ایک منتخب اقتباس ہے۔ اس کے اسلوب میں انیسویں صدی کے دہلی شہر کا محاورہ موجود ہے جسے اکیسویں صدی کے ایسے طالب علموں کے لیے سمجھنا آسان نہیں ہے جن کا اُردو زبان و ادب کے بارے میں علم محدود ہے۔ اس میں بعض متروک قسم کے الفاظ

بھی مستعمل ہیں۔آج کرنسی کی شرح بدل چکی ہے۔پورا ناول پڑھے بغیر اس سبق کی مکمل تفہیم ممکن نہیں ہوسکتی۔تاہم اس میں کسی حد تک اخلاقی پہلو موجود ہے۔''پہلی فتح''،نسیم حجازی کے ناول''محمد بن قاسم'' سے منتخب کیا جانے والا درسی سبق ہے۔ناول کا مکمل مطالعہ کیے بغیر یہ سبق سمجھنا مشکل ہے کیونکہ اس مختصر سے اقتباس کے ذریعے ناول کے مرکزی کردار اور دیگر ضمنی کرداروں کی کوئی واضح صورت سامنے نہیں آتی۔اس سبق میں پنجاب کی معاشرت،سماج اور ثقافت کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔عربی سورماؤں کی بجائے پنجاب کی سرزمین پر جنم لینے والے کسی بہادر جنگجو کا انتخاب کرکے اس کے کارنامے درسی سبق کے طور پر شامل کیے جاسکتے ہیں۔میرزا ادیب کا یک بابی اسٹیج ڈراما ''دستک'' ایک موزوں سبق ہے جو طالب علموں کے ذہنوں پر ایک گہرا اخلاقی،نفسیاتی اور علمی تاثر چھوڑتا ہے کیونکہ پنجاب کے سماج اور معاشرت میں اکثر ایسے واقعات رُونما ہوتے رہتے ہیں۔اس میں ادبیت کا نمایاں عنصر موجود ہے۔ڈرامے کے ایک کردار ڈاکٹر برہان کا درج ذیل فقرہ بہت زیادہ معنویت کا حامل ہے اور اس ڈرامے کے مرکزی خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''میں انھیں بڑے میاں کا پوتا ہوں جس کا بیٹا اُس رات ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا تھا۔''(۱۵)

بیگم اختر ریاض الدین کا سفرنامہ''ہوائی''صرف ایک غیر معیاری سفرنامہ ہی نہیں ہے بلکہ طالب علموں کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے کیونکہ اس میں بیان کردہ معلومات ادھوری ادھوری سی اور اسلوب خشک ہے۔یہ سفرنامے کی بجائے ایک ایسی شادی شدہ خاتون کی آپ بیتی محسوس ہوتا ہے جو شوہر کی جدائی اور اس سے وصال کی صورت حال کو ہوائی جیسے جزیرے کے فطرتی رومان پرور ماحول میں بیان کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اس میں بے معنی جذبات نگاری بوریت کا سبب بنتی۔اگرچہ چراغ حسن حسرت کا شمار اچھے ادیبوں میں ہوتا ہے مگر ان کا شخصی خاکہ''مولانا ظفر علی خاں''محض مداحی ہے جس میں مولانا کی شخصیت وکردار کے منفی پہلوؤں کو یکسر نظرانداز کردیا گیا ہے۔اس سبق میں معرب ومفرس اشعار کی موجودگی مطالعاتی بوریت کا سبب بنتی ہے۔مولانا ظفر علی خاں کو صرف ایک شاعر اور سیاستدان کے طور پر ہی متعارف نہیں کرایا گیا بلکہ انھیں ایک بہترین اتھلیٹ (Athelete) اور سبکدوش فوجی بھی ثابت کیا گیا ہے۔جیسا کہ درج ذیل سطور سے ظاہر ہے

> ''انھیں صرف دوڑنے اور ڈنٹر پیلنے کا ہی شوق نہیں،مگدر بھی ہلاتے ہیں،نیزہ بازی اور شہسواری میں بھی برق ہیں،پیراکی اور کشتی گیری میں بھی بند نہیں،نشانہ بھی اچھا لگاتے ہیں۔حیدرآباد کی ملازمت کے دوران کچھ عرصہ فوج میں بھی رہے۔''(۱۶)

سیّد امتیاز علی تاج کا یک بابی ڈرامہ''قرطبہ کا قاضی''ایک دلچسپ اور تاثراتی سبق ہے جو طالب علموں

کے ذہنوں پر نہ صرف ایک اخلاقی تاثر چھوڑتا ہے بلکہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ علمی لحاظ سے یہ ایک اچھا سبق ہے تاہم پنجاب کی معاشرت میں کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی باپ نے انصاف کے تقاضے پورنے کے لیے اپنے ہی حقیقی لختِ جگر کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کا مضمون ''مواصلات کے جدید ذرائع'' ایک سائنسی مضمون ہے جسے صرف جنرل سائنس کی درسی کتاب ہی کا حصّہ ہونا چاہیے تھا۔ ایسے اسباق میں نہ ادبیت ہے، نہ ثقافت کی جھلک ہے اور پنجاب کے سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ البتہ ایسا مضمون شامل کیا جاسکتا ہے جس میں پنجاب کے لوگوں کی سائنسی ایجادات کے استعمال میں دلچسپی کی جھلک دکھائی گئی ہو اور ان کا تعلق موجودہ پاکستانی ثقافت سے ظاہر کیا گیا ہو۔ سائنس میں روز بروز ترقی کی بدولت، اس سبق میں مندرج مختلف معلومات فرسودہ ہونے کی وجہ سے اپنی قدر و منزلت کھو چکی ہیں مثلاً:

> ''اکیسویں صدی کے آتے آتے مواصلات پر پیغام بھیجنے والے کی تصویریں بھی دکھائی دینے لگیں گی۔ وہ اسی وقت کمپیوٹر میں محفوظ بھی کر لی جائیں گی اور ایک تار پر ایک وقت میں دو کی بجائے ہزاروں آدمی پیغام رسانی کر سکیں گے۔''(۱۷)

آج سائنسی ایجادات سے استفادے کا یہ عالم ہے کہ موبائل فون کا استعمال کرنے والے عام پاکستانیوں کے پاس بھی ایسے موبائل فون سیٹ ہیں جن میں نہ صرف فون کرنے اور سننے کی سہولت ہے بلکہ اس میں کیمرہ، ایف ایم ریڈیو، وڈیو ریکارڈر بھی ہوتا ہے۔ بعض مہنگے موبائل فون سیٹ ایک منی کمپیوٹر کی طرح کام کرتے ہیں اور ان پر کوئی شخص کہیں بھی انٹرنیٹ چالو کر کے اُس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ موبائل فون کے ذریعے مختصر پیغامات (SMS) بھیجنے کا رواج اتنا عام ہے کہ ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص بھی اس سے متعارف ہے۔ انٹرنیٹ پر بات چیت کے دوران دو مختلف جگہوں پر موجود لوگ نہ صرف ایک دوسرے کی آواز سن سکتے ہیں بلکہ ویب کیمرے کے ذریعے ایک دوسرے کی حرکات و سکنات بھی براہِ راست دیکھ سکتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا شخصی خاکہ ''مولوی نذیر احمد دہلوی'' اپنے دادا کی مدح سرائی پر مشتمل ایک نجی قسم کی ادھوری تحریر ہے کیونکہ خاکہ نگار نے اپنے دادا کو صرف پانچ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا۔(۱۸) اتنی چھوٹی عمر کے بچے کو اپنے دادا کی شخصیت کے بارے میں اتنی حتمی اور جامع تفصیلات کیسے معلوم ہو سکتی ہیں؟ اس میں خاکے کے بنیادی تقاضے نظر نہیں آتے کیونکہ مولوی نذیر احمد دہلوی کی شخصیت کا ''یک رخہ'' تعارف کرایا گیا ہے، منفی پہلو سے چشم پوشی کی گئی ہے نیز اس سبق سے عام طالب علموں کے علمی، ادبی، معاشرتی، سماجی اور ثقافتی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اس سبق میں بعض غیر معروف معرب ومفرس اور متروک قسم کے الفاظ مثلاً کنٹوپ، اشرفی، ضدّن، مرفّہ الحال، کھُنڈلا، لیتروں، ہلکا لینا، ڈنڈی کھولنا، ردّو

قدح، شایع وغیرہ شامل ہیں۔ ایک پیراگراف میں مبالغے کی انداز میں مولوی نذیر احمد کو ایک جادوگر مقرر ثابت کرنے کے لیے ایک ایسا فقرہ لکھا گیا ہے جو جذباتی عمر کے نوجوان طلبا و طالبات کے نقطۂ نظر اور سطحی سوچ کے لحاظ سے ایک غیر موزوں فقرہ ہے کیونکہ اس کی گہرائی سمجھنا ان کے بس کا روگ نہیں یعنی:

''سامعین پر جادو سا کر دیتے تھے اور جو کام ان سے چاہتے لے لیتے۔ جب چاہا انھیں ہنسادیا اور جب چاہا ان کی جیبیں خالی کرالیں اور عورتوں کے زیور تک اتر والیا کرتے تھے۔''(۱۹)

ابن انشا کا نثری سبق ''ایک سفرنامہ جو کہیں کا بھی نہیں ہے'' ایک بے ربط سا سبق ہے۔ ویسے بھی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر معاشرت، سماج اور جغرافیائی محل وقوع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں زیادہ تر معلومات ہمسایہ ملک افغانستان کے بارے میں ہیں۔ وہاں طالبان کی اسلامی حکومت، بعدازاں امریکہ نواز کرزئی حکومت اور امریکی افواج کے فوجی آپریشن کے بعد وہاں کی معاشرت نے کئی ارتقائی منزلیں طے کرلیں ہیں۔ سیاسی، معاشرتی اور عسکری تبدیلیوں کے بعد کے افغانستان سے پاکستان عوام سمیت طلبا و طالبات بھی میڈیا کی بدولت کسی حد تک آگاہ ہیں۔ چنانچہ بچوں کو ماضی کے افغانستان کا تعارف کرانے کا کیا علمی وادبی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے؟ رشید احمد صدیقی کی کتاب ''گنج ہائے گراں مایہ'' سے لیا گیا شخصی خاکہ ''ایوّب عباسی'' طالب علموں کی تفہیم سے بالاتر ہے کیونکہ اس کا اسلوب بہت مفرس ہے نیز ایسے شخصی خاکوں کو صرف ادبی ذوق رکھنے والے افراد ہی سمجھ سکتے ہیں۔

حصّہ نظم: اس حصّے کا آغاز مولانا ظفر علی خاں کی ''حمد'' سے ہوتا ہے جو غزلیہ ھیئت میں لکھی گئی ہے۔ حمد کے پہلے چار اشعار میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی گئی ہے جبکہ باقی اشعار ''حمد'' کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ اسلوب خاصا مفرس ہے۔ حفیظ تائب کی ''نعت'' الفاظ و تراکیب کے تناظر میں بے حد معرب و مفرس ہے۔ خیالات کی یکسانیت اور تکرار ہے۔ دلچسپی اور اثر پذیری کا عنصر بہت ہی کم ہے۔ مجموعی طور پر یہ طالب علموں کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے۔ اُردو کی نعتیہ شاعری میں اپنے مواد اور اثر پذیری کے لحاظ سے اس سے کہیں بہتر انتخاب موجود ہے۔ پہلے چار شعر مکمل طور پر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں جن کے آخری میں ایک معرب ترکیب ہے۔ ان میں اُردو پن نظر نہیں آتا۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ے خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر، خیرا لبشر — خوش نژاد وخوش نہاد و خوش نظر، خیر البشر
دل نواز ودل پذیر و دل نشین ودل کشا — چارہ ساز و چارہ کار وچارہ گر، خیر البشر
سر بہ سر مہر ومروّت، سر بہ سر صدق وصفا — سر بہ سر لطف وعنایت، سر بہ سر، خیر البشر
صاحبِ خُلقِ عظیم وصاحبِ لطفِ عمیم — صاحبِ حق، صاحبِ شقُّ القمر، خیر البشر (۲۰)

اکبرالہ آبادی کی دعائیہ نظم ''خدا سرسبز رکھے اس چمن کو، مہرباں ہوکر'' مفرس الفاظ و تراکیب سے بھرپور ہیں۔ علامتی واستعاراتی زبان کی موجودگی میں اس نظم کے اشعار کی تشریح وتفہیم میں بہت دشواری پیش آتی ہے خصوصاً

دیہی طالب علم بوریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری میں اس نظم کے مقابلے میں بہترین انتخاب موجود ہے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کی طویل نظم ''اسلامی مساوات'' ایک اچھی نظم ہے جو اپنے موضوعات اور خیالات کے اعتبار سے عالمگیریت اور آفاقیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں ادبیت، علمیت، اور سماجیت کے عناصر موجود ہیں۔ اشعار میں موسیقیت اور لسانی عنصر بدرجہ اتم موجود ہیں مثلاً

۳؎ یہی ہے عبادت، یہی دین وایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (۲۱)

جوش ملیح آبادی ''سُراغِ راہرو'' ایک علامتی نظم ہے۔ اس میں بھی مفرس الفاظ وتراکیب موجودہ ہیں۔ اگرچہ اس میں سبق آموز خیالات پیش کیے گئے ہیں تاہم علامتی نظم ہونے کی وجہ سے طالب علموں کو اس کی تفہیم میں کسی حد تک دشواری محسوس ہوتی ہے۔ سیّد ضمیر جعفری کی علامتی نظم ''آدمی'' میں بڑی خوبصورتی سے تغیراتِ زمانہ کے زیرِ اثر بنی نوع انسان کی معاشرتی زندگی کے اتار چڑھاؤ بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں علمی، ثقافتی اور سماجی چاشنی موجود ہے۔ اسرار الحق مجاز نے علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم ''جاوید کے نام'' کا ردیف ''پیدا کر'' استعمال کرتے ہوئے اسی اسلوب میں ''نوجوان سے خطاب'' لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بھی قیام پاکستان سے قبل کی مفرس زبان استعمال کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بھی ایک علامتی نظم ہے۔ ''ایک کوہستانی سفر کے دوران میں'' مجید امجد کی ایک خوبصورت، آسان فہم اور سبق آموز نظم ہے جس میں قوم کے وڈیروں اور لیڈروں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس میں چند ایک محاورات کا استعمال ملتا ہے۔ یہ نظم پوٹھوہاری و پہاڑی طالب علموں کی ثقافت کی جھلک پیش کرتی ہے۔ احسان دانش کی نظم 'تغیر' میں ہماری معاشرتی وسماجی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی مثالوں سے کی گئی ہے۔ معروف پاکستانی شاعر انور مسعود نے اپنے ''قطعات'' میں مہنگائی، عالمی سامراجی نظام، قدیم شہر ہڑپہ اور دفتری نظام کی خرابیوں کو طنز و مزاح کے دلچسپ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مسائل ہمارے ملک اور مقامی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔

حصّہ غزل: خواجہ میر درد کی دونوں غزلوں ''کام مردوں کے جو ہیں، سو وہی کر جاتے ہیں'' اور ''کیا فرق داغ وگل میں کہ جس گل میں بو نہ ہو'' میں صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات پیش کیے گئے ہیں جو اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے طالب علموں کی ذہنی سطح اور علمی قابلیت بالاتر ہیں، انھیں صرف ایک تربیت یافتہ قاری ہی سمجھ سکتا ہے۔ مفرس الفاظ و تراکیب جابجا استعمال کیے گئے ہیں۔ اگرچہ پہلی غزل کے ابتدائی دونوں شعر عام فہم ہیں تاہم اس کے باقی اشعار اور خصوصاً دوسری غزل کے اشعار اپنے اسلوب، الفاظ وتراکیب اور مضامین کے اعتبار سے مجموعی طور پر مشکل ہیں مثلاً

۴؎ جوں شمع جمع ہوویں گر اہلِ زباں ہزار آپس میں چاہیے کی کبھی گفتگو نہ کریں
۵؎ جوں صبح، چاکِ سینہ مرا، اے رفو گراں ! یاں تو کسو کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

۶؎ اے دردؔ !زنگ صورت اگر اس میں جا کرے　　　اہلِ صفا میں آئینہ دل کو رُو نہ ہو (۲۲)

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی دونوں غزلیں ''دنیا میں جب تک کہ میں اندوہ گیں رہا'' اور ''نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر'' اپنے مضامین، اسلوب اور مفرس الفاظ وتراکیب کے لحاظ سے انٹر کے طالب علموں کی اکثریت کے لیے بے حد مشکل اور نا قابل فہم ہیں تاہم دوسری غزل کے اشعار پہلی غزل کے اشعار کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ پہلی غزل کا مقطع ''رکھوں میں روک کر کیوں کر دل اپنے کو مصحفیؔ'' پنجاب کی معاشرت اور ثقافت کے تناظر میں ایک قابل اعتراض شعر ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کی دونوں غزلیں ''بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا'' اور ''کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فُغاں کیوں ہو'' نہ صرف مفرس الفاظ وتراکیب پر مشتمل ہیں بلکہ ان میں عشقیہ خیالات کی بھرمار ہے جو ہماری معاشرت اور ثقافت سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔ آج موبائل اور انٹرنیٹ کے دور میں غالبؔ کے بیشتر اشعار کے مضامین صرف ماضی کی داستان بن چکے ہیں۔ ایسی باتیں روزی روٹی کے جھنجٹ سے آزاد فارغ البال رئیسوں اور نوابوں ہی کو زیب دیتی تھیں۔ غالب نے اشاروں، کنایوں اور دیگر علامتوں کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ صنائع بدائع اور عروض جانے بغیر ان اشعار کو سمجھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پہلی غزل کا دوسرا اور تیسرا شعر نہ صرف بچوں کی ذہنی سطح سے بلند ہے بلکہ ان میں بیان کردہ خیالات ومضامین کی کمرہ جماعت میں تشریح بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

۳؎ عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ　　　عید نظّارہ ہے ، شمشیر کا عریاں ہونا
۴؎ لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط　　　تُو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا (۲۳)

علامہ اقبال کی پہلی غزل ''جب عشق سکھاتا ہے، آدابِ خودآگاہی'' کا چوتھا شعر (اے طائر لاہُوتی! اس رزق سے موت اچھی) اکثر سکولوں کی دیواروں پر لکھا ہوتا ہے اور مختلف مواقع پر تقریروں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم دیگر اشعار اس قدر مفرس اور فلسفیانہ خیالات کے حامل ہیں کہ گھنٹوں تشریحی لیکچر سننے کے بعد بھی، طالب علم ان اشعار کی اپنے لفظوں میں توضیح وتشریح نہیں کر پاتے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کا استاد طالب علموں کی بجائے کسی دیوار کے سامنے لیکچر دیتا رہا ہو۔ دوسری غزل ''نہ تخت وتاج میں، نے لشکر وسپاہ میں ہے'' میں بھی معرب ومفرس الفاظ وتراکیب کی بھرمار ہے اور مختلف اشعار فلسفیانہ مضامین کے حامل ہیں۔ حالانکہ علامہ اقبال کی اُردو شاعری میں بہترین انتخاب کی کمی نہیں ہے۔

ناصر کاظمی کی پہلی غزل ''دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی'' کے اشعار میں ایک طرف تقسیم ہند کے فسادات

اورعزیز واقارب سے جدائی کا پس منظر ہے،تو دوسری طرف اپنوں سے ملن کی خواہش وامید بھی ہے۔ دوسری غزل ''اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی'' میں ناصر کاظمی علاقائی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے پنجاب کے مقامی لوگوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ انھیں ''بے دل'' اور ''شعور سے محروم'' قرار دیتا ہے۔ انھیں دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کا حامل سمجھتا ہے۔ تیسرے شعر میں بھی اسے ہجرت سے پہلے کا اپنا وطن اور ہجرت کے بعد گم شدہ مہاجر بھائیوں کی یاد ستاتی ہے۔ اس میں پنجاب کی معاشرت، ثقافت اور موجودہ سماج کی کون سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ناصر کاظمی کی ذاتی زندگی کی تلخیوں سے طالب علموں کے لیے کون سا سبق ہے؟ کتاب کے مؤلفین ایسی غزلوں سے کالج کے طلبا وطالبات کو کیا سکھانا چاہتے ہیں؟ بقول ڈاکٹر شاہد اقبال غزلیات کی انفرادیت اور نئے پن کے شوق میں طالب علموں کی ذہنی سطح اور معاشرتی محدودات کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔(۲۴) اشعار ملاحظہ ہوں:

ع کن بے دلوں میں پھینک دیا، حادثات نے — آنکھوں میں جن کی نور، نہ باتوں میں تازگی

ع بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمین — میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی (۲۵)

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی غزل ''اُداسی، بے دلی، آشفتہ حالی میں کمی کب تھی'' میں بھی روایتی غزلیہ مضامین ہیں جو آج کے طالب علموں کی دلچسپیوں کا محور ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ہر شعر میں فارسی تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے۔ تابش دہلوی کی غزل ''سکوں درکار ہے لیکن سکوں حاصل نہیں ہوتا'' میں بھی مفرس تراکیب کا بکثرت استعمال ہے۔ اس غزل کے اشعار کے مضامین ایک ناکام عاشق کے دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ بوریت کی حامل ایک مشکل نظم ہے۔

''سرمایۂ اُردو'' کے دونوں حصوں کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ درسی کتاب کے اسباق قدیم وجدید اُردو ادب کا بے جوڑ اور غیر منطقی امتزاج ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں اُردو ادب کی تمام اصناف سمونے کی کوشش کی گئی ہو اور انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کے سامنے ایم اے اُردو کے مختلف نصابی مشمولات کو اجمالی اور انتہائی محدود صورت میں پیش کیا جا رہا ہو۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کا کہنا ہے کہ وفاقی نصاب ساز ادارے کی نصابی سفارشات کی روشنی میں انواع واقسام کے ادبی متون پر مشتمل درسیات مرتب کرنا درست نہیں ہے کیونکہ میڈیکل، انجینئرنگ، آرٹس، کامرس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے طالب علموں کا ادبی درسیات کے ذریعے اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنا بنیادی مقصد نہیں ہوتا۔ ایسے متنوع اسباق کی تدریس کے دوران سائنس وآرٹس کے طالب علم یکساں طور پر دقت محسوس کرتے ہیں۔(۲۶) نظم ونثر کے درسی اسباق کے انتخاب کے وقت بالعموم طالب علموں کے ادبی ذوق، ان کے لسانی وثقافتی، سماجی ومعاشرتی اور معاشی حالات مدنظر نہیں رکھے گئے ہیں جبکہ پنجاب کے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں میں ادبی ذوق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ دیہی اور پس

ماندہ علاقوں کے طالب علم بڑی مشکل سے اپنے تعلیم جاری رکھتے ہیں، انھیں اُردو ادب سے شغف کہاں؟ پنجاب میں سکولوں میں ریاضی اور سائنس کے مضامین کی تدریس کے ذریعہ تعلیم ''انگریزی زبان'' ہونے کے بعد اُردو لازمی کے لیے مختص وقت کا دورانیہ مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ مروجہ نصابی مشمولات کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق احمد کہتے ہیں کہ پاکستانی نظام تعلیم میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ درجات کے مابین عملی ربط صرف نصاب کے ذریعے پیدا ہوتا ہے لیکن ہماری تعلیمی زندگی کا یہ ربط جا بجا کٹا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ ایک درجے کے درسی مشمولات کا اگلے درجے کے درسی مشمولات سے کوئی منطقی اور علمی ربط موجود نہیں ہے۔ مروّجہ درسی مواد طالب علموں کی دلچسپیوں، نفسیاتی ضروریات، معاشرتی اور عمرانی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس میں پاکستانی کلچر اور تہذیب وتمدن موجود نہیں ہے۔ درسی مواد کی صورت میں شامل نصاب باتیں طالب علموں کے عملی مشاہدے، تجربے اور ماحول سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ جس کی وجہ سے ان کی عملی اور نظری زندگی میں ایک تضاد پیدا ہوتا ہے جو شخصیت کے انتشار پر منتج ہوتا ہے۔ ان میں لسانی تفہیم اور اظہار خیال کی صلاحتیں ناپید ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔[۲۷]

اُردو لازمی کے مؤلفین حضرات بالعموم پنجاب کی شہری و دیہی معاشرت اور لسانی صورت حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے پنجاب کے مختلف علاقوں کی شرح خواندگی اور وہاں مادری زبان کے چلن کے حوالے سے کوئی مستند معلومات نہیں ہوتیں۔ صرف خانہ پری کی غرض سے اُردو نظم ونثر کی مختلف اصناف کے نمونے درسی اسباق کے طور پر شامل کر دیے جاتے ہیں۔ بیشتر مؤلفین حضرات سفارشی ہوتے ہیں اور ان کی تعیناتی بالعموم سیاسی ذرائع سے عمل میں آتی ہے۔ اُردو لازمی کے مؤلفین نظم ونثر کے ایسے نمونے اسباق کے طور پر شامل کر رہے ہیں جن میں تیر وتلوار کے دور یا ماضی بعید کی ثقافتی جھلکیاں ملتی ہیں یا پھر عشقیہ جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ زبان ثقافت کو محفوظ ہی نہیں کرتی بلکہ ثقافت کی تشکیل بھی کرتی ہے۔[۲۸] اس بیان کی روشنی میں اُردو لازمی کی درسی کتاب کا موادنہ تو پاکستانی ثقافت کا عکاس نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کے مطالعے سے پنجاب کے طالب علموں کو پاکستانی یا خطہ پنجاب کی ثقافت سکھائی جا سکتی ہے۔ درسی مشمولات ایک ان دیکھے اور غیر مشاہداتی قدیم ہندوستانی کلچر کی نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کو قومی زبان کا درجہ ملنے کے باوجود گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران ملک کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسے ویسی لسانی پزیرائی نہ مل سکی جس کی وہ مستحق ہے کیونکہ تدریسی سطح پر مقامی اُردو ادب اور ثقافتی عناصر سے چشم پوشی برتی گئی ہے۔ عملی زندگی میں ہماری سماجی، ثقافتی، معاشرتی اور بدلتی ہوئی تہذیب کی لسانی ضروریات سے اُردو زبان کی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی سماج وثقافت اور تہذیب وتمدن میں انگریزی زبان غلبہ پا تی جا رہی ہے۔

''سرمایہ اُردو'' میں بے شمار متروک قسم کے معرب ومفرس الفاظ وتراکیب شامل ہوتے ہیں۔ اگر امتحانی

نقطہ نظر سے چند ایک طالب علم درسی اسباق میں موجود ایسے معرب ومفرس الفاظ سیکھ بھی لیتے ہیں، تو پنجاب کی معاشرت اور سماج میں ایسے الفاظ کا چلن نہ ہونے کی وجہ سے انھیں جلد ہی بھلا بیٹھتے ہیں۔ گیارھویں بارھویں کی درسی کتب کی غزلیات صوفیانہ، عشقیہ اور فلسفیانہ مضامین کی حامل ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے چند دن کی محدود قرأتی تربیت کافی نہیں ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر شاہد اقبال کامران اُردو درسیات میں غزل کی تدریس ایک نازک اور محتاط غور وفکر کا متقاضی موضوع ہے۔ قدیم وجدید اُردو غزلوں میں جن تصورات کو پیش کیا جا رہا ہے، ان کی عملی زندگی میں ایک واضح سماجی، ثقافتی، ادبی اور علمی افادیت ہونی چاہیے۔ شاعری کو مجموعی طور پر نوجوانوں میں ہمت، حوصلہ، زندگی اور اس کی جملہ سرگرمیوں میں دلچسپی پیدا کرنے والی ہونی چاہیے۔ جن غزلوں کی تدریس کے دوران ذرا سی بھی تدریسی الجھن یا لسانی پریشانی کا امکان ہو، ان کی بجائے دیگر غزلوں کے انتخاب کو ترجیح دی جانی چاہیے۔[۲۹] اعلیٰ ثانوی سطح پر اُردو منظومات اور غزلیات کا مطالعہ اپنے معیار کے اعتبار سے ایک محتاط نظر ثانی کا محتاج محسوس ہوتا ہے۔[۳۰] سائنس کے طالب علم صرف مجبوری کے تحت اُردو لازمی پڑھتے ہیں۔ اگر انھیں اختیار دے دیا جائے، تو وہ اُردو کی بجائے کوئی دیگر سائنسی مضمون منتخب کر لیں جبکہ آرٹس مضامین پڑھنے والے طالب علموں کی اکثریت اُردو سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ پاکستانی معاشرت میں عوامی سطح پر لائبریری کلچر آہستہ آہستہ محدود ہوتا جا رہا ہے اور اُردو ادب سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔

انٹرمیڈیٹ کی اُردو لازمی کی درسی کتب مرتّب کرتے وقت پنجاب کے تینوں لسانی خطوں (پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری) کے شہری ودیہی علاقوں کے کالجوں میں تدریس اُردو کے دوران درپیش مسائل ومشکلات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے صنفی جذبات کا خیال رکھنا بھی لازمی ہے۔ پروفیسر خیال بخاری کی رائے میں کالج کے طلبا وطالبات کو اُردو لازمی کی تدریس کا مقصد ان سب کو ادیب یا شاعر بنانا نہیں بلکہ انھیں اُردو زبان سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ اسے سن کر سمجھ سکیں نیز روانی اور آسانی سے پڑھ اور بول سکیں۔ لہٰذا اُردو لازمی کی درسی کتب میں خالص ادبی اور شعری انتخاب کی بجائے لسانیاتی تناظر میں سماجی، اخلاقی، ثقافتی، علمی اور معلوماتی مواد ہونا چاہیے۔[۳۱] علاوہ ازیں، انھیں صرف مرد شعراء کے کلام سے روشناس نہ کرایا جائے بلکہ اُردو شاعرات کے کلام سے بھی متعارف کرایا جانا چاہیے۔ اگر اُردو شاعرات کا کلام شامل نصاب کرنا قومی مقاصد کے منافی ہے، تو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایک جیسی عشقیہ غزلیات کا انتخاب درسی اسباق کے طور پر شامل کرنا کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ اعلیٰ ثانوی سطح تک اُردو لازمی کی درسیات میں ایک بھی شاعرہ کا کلام شامل نہیں ہے۔ یہ نہایت مایوس کن ہے اور اس میں چھپی حکمت کو سمجھنا نہایت مشکل ہے[۳۲] درسی اسباق کے انتخاب کے سلسلے میں سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ طلبا وطالبات کی گزشتہ درجات میں اکتسابی لسانی صلاحیتوں کو مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ انھوں نے میٹرک تک کس

حد تک اردو سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں میں پختگی حاصل کر رکھی ہے؟ ان کا نظری و عملی ذخیرہ الفاظ کتنا ہے؟ انھیں گزشتہ درجات میں کس قسم کا درسی مواد پڑھایا گیا ہے؟ کیا موجودہ درسی مواد گزشتہ درجات کے درسی مواد کی اگلی کڑی ثابت ہوگا یا ان میں بہت زیادہ خلا موجود ہے۔ ان کی سماجی، ثقافتی اور قومی تناظرات میں لسانی ضروریات کیا ہیں؟ بقول ڈاکٹر شاہد اقبال کامران:

> ''قومی رابطے کی زبان اور قومی تشخص کی علامت، اُردو زبان کی تدریس کے لیے درسی کتب مدوّن کرتے وقت طالب علموں کے علاقائی، لسانی اور ثقافتی پس منظر کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔''(۳۳)

اکیسویں صدی میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون، لیزر ٹیکنالوجی اور دیگر حیرت انگیز سائنسی ایجادات انسان کی روزمرہ زندگی کا حصّہ بن چکی ہیں۔ معمولات زندگی میں ایک تیزی سی آنے کی وجہ سے ہر فرد کی ترجیحات اور معاشرتی قدریں تبدیل ہوچکی ہیں۔ موبائل وانٹرنیٹ کے ذریعے پیغام رسانی کی سہولت (شارٹ میسج سروس،SMS) طالب علموں کی عام پہنچ میں ہونے اور کیبل کے متنوع ٹی وی چینلوں کی دستیابی کی وجہ سے انھیں اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ایسے شعراء کی غزلیات کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں جن کی شاعری کا ان کی مادری زبان کی معاشرت، سماجی قدروں اور ثقافت سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری کی معرب ومفرس اُردو زبان اور اشعار میں پیش کیے جانے والے مضامین کو سمجھنے میں بہت دشواری محسوس کرتے ہیں کیونکہ آج ہر عاشق اپنے معشوق کو براہ راست کال کرکے بات کرلیتا ہے یا پھر میسج (SMS) بھیج دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور انٹرنیٹ تک رسائی رکھنے والا طبقہ اپنے متعلقین کو ای میل کر دیتا ہے۔ دفتری اور کاروباری مقاصد کے تحت فیکس مشین ایجاد ہوچکی ہیں جن کے ذریعے ہم اپنی تحریریں اور ہر قسم کی دستاویزات فی الفور پوری دنیا میں کہیں بھی کسی وقت بھی بھیج سکتے ہیں۔ گویا فیکس اور ای میل (انٹرنیٹ کے ذریعے بھیجی جانے والی ڈاک) اب ہماری تعلیمی، دفتری، ثقافتی اور معاشی زندگی کا ایک لازمی جزو بنتا جا رہا ہے۔ ای میل کے لیے اب کمپیوٹر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی کیونکہ ایسے جدید ترین موبائل فون ایجاد ہوچکے ہیں جن کی مدد سے ہم چلتے پھرتے انٹرنیٹ تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں اور ہر قسم کے پیغامات، تصویریں اور ویڈیو ریکارڈنگ دوسرے افراد تک بھیج سکتے ہیں۔ لہٰذا مادہ پرستی اور میکانی زندگی کے موجودہ دور میں، نہ صرف طالب علم بلکہ ان کے والدین بھی انھیں جدید علوم سکھانا چاہتے ہیں۔ اردو ادب محض ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ میاں بشیر احمد لکھتے ہیں کہ

> ''جہاں تک اُردو کی ادبی ضروریات کا سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے لیے بزرگانِ سلف نے ادب کا ایک بہت بڑا ترکہ چھوڑا ہے۔ اُس میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ ہمارا کام اپنی

ضروریات کے مطابق ان کمیوں کو پورا کرنا اور نئی نئی چیزوں کا پیدا کرنا ہے۔ ہماری اکثر پرانی قسم کی غزلوں میں ایک خیالی صنم کے عشق میں بے قرار رہنا مصنوعی محبت کی نوک جھونک، مبالغے میں زمین آسمان کے قلابے ملانا، سرد آہیں بھرتے رہنا، ہر گھڑی مقدر کا رونا، کفن سر سے باندھے رکھنا، یہ ایک اُلٹی قسم کی ذہنیت اور ایک غیر فطری اور بے کار اور لغو زندگی کی علامات ہیں۔ اب نہ ایسی خیال آرائی برداشت کی جا سکتی ہے نہ ایسی ناز برداریاں ہو سکتی ہیں۔''(۴۴)

انٹر میڈیٹ کی سطح پر اُردو لازمی کی تدریس کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ درسی مواد کے ذریعے طالبعلموں میں اتنی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اُردو زبان کی مختلف مہارتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُسے احسن طریق سے رابطے کی زبان کی حیثیت سے استعمال کر سکیں۔ اُردو تحریر و تقریر میں روانی اور درستی سے اپنا مافی الضمیر بیان کر سکیں اور اُردو ادب کی تفہیم کر سکیں۔ طالب علموں کے لیے اُردو لازمی کی درسی کتب تالیف کرتے وقت ان میں صرف ایسا درسی مواد شامل کیا جائے جو اکیسویں صدی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو نیز طالب علموں کی سماجی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی، نفسیاتی، علمی، ادبی اور لسانی ضروریات کی تشفی کر سکے۔ طلبا و طالبات میں اردو زبان و ادب کے لیے دلچسپی پیدا کی جا سکے۔ ان کے عملی و نظری ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو سکے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اپنی تقریر و تحریر میں شائستگی، ربط، تسلسل، معنویت اور مقصدیت قائم رکھ سکیں۔ میاں بشیر احمد کی رائے میں مستند، عام فہم اُردو سیکھنے سکھانے والی کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ جن کے ذریعے نہ صرف ملکی و غیر ملکی مبتدی اردو زبان آسانی سے سیکھ سکیں بلکہ اخبار نویس، انشا پرداز اور انگریزی زدہ لوگ بھی اُردو میں آسانی سے اپنے مطالب ادا کر سکیں۔(۴۵)

پاکستانی طالب علموں کو اُردو شاعری سے بہتر طور پر متعارف کرانے کے لیے دو قسم کے اقدامات ضروری ہیں۔ پہلی قسم کے اقدامات کا تعلق درسی اسباق کی چھپائی سے ہے جبکہ دوسری قسم کے اقدامات کا تعلق اُردو استاد کے طریقہ تدریس سے ہے۔ کالج کے عام طالب علموں اور بعض بد ذوق اُردو اساتذہ میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ مصرعے میں کس جگہ سکتہ کرنا ہے اور کہاں سکتہ نہیں کرنا۔ چنانچہ شاعری کی مؤثر تفہیم کے لیے درسی کتاب کے حصہ نظم کے اسباق میں رموزِ اوقاف مثلاً سکتہ (،)، سوالیہ (؟)، ندائیہ / فجائیہ (!)، علامتِ تخلص (ؔ) وغیرہ کا خصوصی التزام کیا جانا چاہیے۔ شعر کا ہر مصرعے چھوٹے چھوٹے قرأتی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے بعد سکتہ کا نشان (،) لگایا جانا چاہیے۔ نثری اسباق کے برعکس ہر مصرعے میں شامل الفاظ، مرکبات اور تراکیب کا باہمی فاصلہ کم از کم اتنا ضروری ہے کہ وہ نمایاں طور پر نظر آ سکیں۔ حصّہ نظم (نعت، حمد، نظم، غزل، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ) کے ہر سبق کے آخر میں مشکل الفاظ، مرکبات، تلمیحات اور تراکیب کی فرہنگ شامل کی جا سکتی ہے تاکہ طالب علموں کو ان کے معنی و مفہوم فوری طور پر جاننے کے لیے الگ سے کسی امدادی کتاب یا لغت کا سہارا نہ لینا پڑے۔ نظم اور غزل

کے شروع میں اُس شاعر کے جامع ومختصر حالاتِ زندگی اوران کے کلام کی منفرد خصوصیات درج کی جاسکتی ہیں جن کا کلام درسی اسباق کے طور پر شامل ہے۔اُردوادب کی تاریخ سے اُس دور کے سیاسی وسماجی حالات اور معاشرتی وثقافتی اقدار کا اجمالی خاکہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو کسی شاعر کے کلام پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔تاکہ طالب علم کسی شاعر کے عہد کو سامنے رکھ کر اس کے خیالات، جذبات اوراحساسات کی بہتر طور پر ترجمانی کرسکیں کیونکہ ادب پارے سے ادیب کی ذات کی عکاسی ہوتی ہے اور دونوں کو جدا جدا نہیں دیکھا جاسکتا۔

نوٹ: آج کل انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں کے لیے اُردو لازمی کے نصاب کی تبدیلی کا چرچا ہے اور ۲۰۱۰ء میں صرف سال اوّل کے طالب علموں کے لیے اُردو لازمی کی نئی مرتّب شدہ کتاب منظرعام پر آئے گی۔اگر اس نئی مرتب شدہ کتاب میں بھی صرف سرورق اور درسی اسباق کے عنوانات میں بظاہر تبدیلی نظر آئے اور اپنے درسی مواد کے موضوعات، اسلوب، ذخیرہ الفاظ اور دیگر لسانی پہلوؤں کے معاملے میں مروّجہ درسی کتاب سے زیادہ مختلف نہ ہو یعنی اس میں بھی پنجاب کے مختلف لسانی خطوں کی تہذیب وثقافت کو اجاگر کرنے کی بجائے اٹھارویں یا انیسویں صدی عیسوی کی قدیم ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی گئی ہو، اسے اکیسویں صدی کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جدید دور سے ہم آہنگ نہ کیا گیا ہواوراس میں اُردو زبان کی چاروں لسانی مہارتوں ''سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا'' میں سے ہر ایک کو مناسب لسانی اہمیت نہ دی گئی ہو، تو اُردو لازمی کی ایسی نئی کتاب کی نصابی سازی کے لیے تگ ودو کرنا قومی دولت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

حوالہ جات

۱۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو تدریسیات، لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۔ نصیر احمد خاں، اُردو لسانیات، دہلی: اُردو محل پبلی کیشنز نئی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۴

۴۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو تدریسیات، ص ۵۲

۵۔ شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر، پاکستان میں تدریس اُردو: پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۷۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو: جدید تقاضے، نئی جہتیں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۸

۸۔ سرمایۂ اُردو، برائے گیارھویں جماعت، لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، کوڈ نمبر XLVI.AL، طبع پنجم، س ن، ص ۲۲

۹۔ سیّد خیال بخاری، پروفیسر، ہمارے لسانی مسائل، لاہور: بساط ادب، طبع دوم، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵

۱۰۔ سرمایۂ اُردو، برائے گیارھویں جماعت، لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، ص ۷۶

۱۱۔ ایضا، ص ۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۳۔ سرمایۂ اُردو، برائے بارھویں جماعت، لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، کوڈ نمبر XLVI/ AD، طبع سوم، س ن، ص ۱۸

۱۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد: خواندہ، شنیدہ، فہمیدہ، ماخوذ از نگارستانِ آزاد، جنوری ۲۰۱۰ء، مشمولہ ماہنامہ، اخبار اُردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، شمارہ فروری ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۱۵۔ سرمایۂ اُردو، برائے بارھویں جماعت، لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ص ۴۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۲۴۔ شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر، پاکستان میں تدریس اُردو: پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک، ص ۳۱۵

۲۵۔ سرمایۂ اُردو، برائے بارھویں جماعت، ص ۱۳۱

۲۶۔ شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر، پاکستان میں تدریس اُردو: پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک، ص ۲۹۷

۲۷۔ رفیق احمد، پروفیسر ڈاکٹر، ہمارا نصابِ تعلیم، مشمولہ: پاکستان میں تعلیم: ایک تحقیقی جائزہ، مرتبہ: ڈاکٹر انجم رحمانی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۶۱

۲۸۔ ناصر عباس نیر ڈاکٹر، گلوبلائزیشن اور اُردو، مشمولہ: پاکستانی اُردو، مرتبہ: ڈاکٹر عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۹

۲۹۔ شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر، پاکستان میں تدریس اُردو: پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک، ص ۳۰۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۲۱

۳۱۔ سیّد خیال بخاری، پروفیسر، ہمارے لسانی مسائل، ص ۱۵۸

۳۲۔ شاہد اقبال کامران، ڈاکٹر، پاکستان میں تدریس اُردو: پہلی جماعت سے اعلیٰ ثانوی سطح تک، ص ۳۲۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۶۲

۳۴۔ بشیر احمد، میاں، اُردو: پاکستان کی قومی زبان، مرتبہ: محمد حنیف شاہد، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۵۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۹